Volume 03, Issue 01,
January-March 2025
PP: 96-106
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

ادبی کالم نگاری (1947ء تا تقسیم بنگال)

Literary Column Writing

(From 1947 to the Bengal Partition)

Noor Abbas Anjum[1], Dr. Muhammad Salman Bhatti[2]

Article History

Received
05-02-2025

Accepted
20-02-2025

Published
23-02-2025

Indexing

Abstract

This research article explores the evolution and distinctive features of literary column writing in Pakistan from 1947 to the Partition of Bengal. It begins by highlighting the pioneering columnists who, after the establishment of Pakistan, played a crucial role in shaping literary column writing as a recognized literary genre. The study examines the intricate relationship between literary columns and literature, establishing their significance in the literary and journalistic landscape of Pakistan. Key questions addressed in this study include: What defines a literary column? How does it relate to literature, and in what ways does it meet literary demands? Additionally, the research delves into the role of gender and nationalistic discourse in Pakistani journalism. The origins of column writing in the shibh-e-qārrah (subcontinent) and its contemporary standing are also explored. The study considers the influential newspapers of the subcontinent that significantly contributed to the development of literary column writing.

The research further analyzes the themes covered in literary columns, including the socio-political conditions of Pakistan, the imposition of martial law, political turmoil, and the challenges faced by the nation in its early years. Special focus is given to the tenure of Ayyūb Khān, the censorship imposed on journalism, and the struggles of columnists who resisted these restrictions. Moreover, the article examines the political ascent of Zulfiqār ʻAlī Bhutto, the Fall of Ḍhākā, and the subsequent political conflicts. It concludes by discussing the power struggles among political parties, internal disputes, the arrest of Shaykh Mujībūr Raḥmān, and the eventual separation of East Pakistan.

Keywords:

Adabī kālim, Pākistān, ṣaḥāfat, 1947, Bangāl kī taqsīm, Ayyūb Khān, Zulfiqār ʻAlī Bhutto, Column, Literary Columnism, Newspaper, Politics, Topics,

[1]*Ph.D. Scholar, Department of Urdu, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore. noor.abbas485@gmail.com*

[2]*Associate Professor, Head of Urdu Department, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore. msalman@ue.edu.pk*

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

ROAD DIRECTORY OF OPEN ACCESS SCHOLARLY RESOURCES

OPEN ACCESS

کالم نگاری اردو ادب کی اہم ترین صنف ہے جس نے اردو ادب کی بہت زیادہ خدمت کی ہے اور اب تک نثری میدان میں جتنا ادب کالم نگاری کے ذریعے تحریر ہو چکا ہے شاید ہی کسی اور صنف میں تحریر ہوا ہو۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں کالم تحریر نہ ہوتا ہو۔ اردو زبان میں بھی روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں کالم تحریر ہوتے ہیں جو روزنامہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، ماہنامہ، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ کی شکل میں قارئین کے لیے میسر ہوتے ہیں۔ اب تک سینکڑوں کی تعداد میں کالموں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور ہر روز اس تعداد اور اس کے قارئین میں قدرے اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ کالم نگاری نے معاشرتی ناہمواریوں کو اور اس میں ہونے والی گوناگوں تبدیلیوں کو بیان کرنے کی جو اہم ذمہ داری نبھائی ہے ایسی کسی اور صنف میں بیان نہیں ہو سکی، حالانکہ شاعری، ناول اور افسانہ تو خاص کر ایسی اصناف ہیں جو معاشرے سے ہی اپنے موضوعات و عنوانات کا انتخاب کرتے ہیں اور اگر ان اصناف سے معاشرہ تھوڑی دیر کے لیے جدا کر دیا جائے تو یہ اصناف ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتیں۔ پھر بھی اگر غور کیا جائے تو جتنا ادب خاص کر معاشرتی ادب کالم میں بیان ہوا کوئی اور صنف اس کے قریب بھی نہیں جا سکی۔ کالم نگار معاشرے کا ایک ایسا لکھاری ہوتا ہے جو تمام سماجی مسائل پر یوں نظر رکھتا ہے کہ اس کے قلم کی زد میں ہر اونچ نیچ، ذات پات، چھوت چھات، فریب کاری اور مکاریاں آتی جاتی ہیں اور وہ ان کو منظر عام پر لاتا جاتا ہے۔

ادبی کالم نگاری کیا ہے؟ اس کا درست جواب تب میسر ہو گا جب یہ پتہ چل جائے کہ ادب چیز کیا ہے؟ یہ سوال آج تک اپنی پوری جامعیت کے ساتھ اردو ادب کے محققین، مصنفین اور ادباء کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے جس کا خاطر خواہ جواب تا حال میسر نہیں ہو سکا۔ از منہ قدیم سے لے کر آج تک کے مفکرین و مدبرین جن کا تعلق مغرب و مشرق سے رہا انہوں نے ادب کی تعریف پر اپنی اپنی آراء پیش کی ہیں مگر کوئی ایک جامع اور مستند تعریف ایسی مقرر نہیں ہو سکی جو اس لفظ کی پوری ادائیگی کر سکے، کیونکہ یہ ایک کثیر المعانی اصطلاح ہے جس کو چند لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ محققین کی آراء اور نقطہ نظر میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اس اختلاف نے ادباء کو کسی ایک نقطے پر جمع نہیں ہونے دیا۔ یہ لفظ ویسے بھی عربی زبان سے اردو میں رائج ہوا جس کے اصلی معنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے اور ہر عہد کے مصنفین نے اس لفظ کے معانی اپنے طور پر متعین کیے۔ پہلی صدی ہجری میں اسلامی دنیا میں ادب کو تعلیم کے مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا کیونکہ عربی و فارسی کتابوں میں لفظ ادیب کو معلم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور ادب خالصتاً جدید اور خاص مفہوم کے معنوں میں رائج ہونے تک عربی و فارسی بلکہ اردو میں بھی ان معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ قدیم عربی زبان میں ادب سے مراد وہ تحریریں لی جاتی تھیں جو عربی پر مہارت حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتی تھیں اور یہ معنی و مفہوم قدیم ادوار میں شامل رہے ہیں کہ ادب کو عموماً علم سے ہی تعبیر کیا جاتا رہا ہے فنون ادبیہ وہ فنون تھے جو اپنے عہد کی اعلیٰ ترین تحریریں سمجھی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں اس اصطلاح کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

ڈاکٹر احمد قدوس جاوید "ادب اور سماجیات" میں ادب کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "تخلیقی زبان کی ایک مخصوص صداقت ہوتی ہے جسے شعری صداقت (Poetic Reality) کہتے ہیں۔ شعری صداقت ٹھوس صداقت سے قدرے مختلف ہوتی ہے کیونکہ شعری صداقت کا عرفان عقل سے زیادہ وجدان کی مدد سے حاصل ہوتا ہے اور اس وجدانی صداقت (Intutional Reality) کی رہبری تخلیقی زبان کرتی ہے۔ غرض یہ کہ تخلیقی زبان کی تشکیل کے لیے شاعر و ادیب کو زبان کی روایات، زبان کے منصب، الفاظ کی قوت، مفہوم کی بلندی، فکر و خیال کی ہمہ گیری اور ترسیل و ابلاغ کی آسانی سب کا نہ صرف خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ انہیں کچھ اس طور سے برتنا ہوتا ہے کہ زبان کے امکانات میں وسعت بھی پیدا ہو اور اپنی اور قاری کی ایک ایک حس کو خارجی اشیاء میں داخل کرنے اور خارجی

اشیاء کو اپنی اور قاری کی ایک ایک حس میں جذب کرنے کی صورت بھی نکل آئے۔ چنانچہ اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق کے تعلق سے یہ ایک ایسا پر پیچ اور جان گسل مرحلہ ہوتا ہے جس سے ہر کس و ناکس بآسانی عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا کیونکہ شاعر یا ادیب کا ذہن کسی بھی سبب، جب تخلیق ادب کی جانب راغب ہوتا ہے تو اپنے افکار و خیالات شعر و ادب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے موضوں و مناسب الفاظ، استعارات اور علائم کا انتخاب شروع کرتا ہے، اس موقع پر شاعر یا ادیب اپنے فکر و شعور، عقل و منطق، قوت تخیل، جذبہ تجسس، طبیعت کی موزونیت اور مہارت فن سب کو بروئے کار لاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تخلیق شعری یا ادبی تخلیق ہی نہیں ہو گیا اور بعض تخلیقی عناصر کی اتفاقیہ موجودگی کے سبب ہو گی بھی تو اس میں فنی اعتبار سے وہ بلندی اور ہمہ گیری نہیں ہو گی جو اعلیٰ ادب کا طرہ امتیاز ہے۔"[1]

اب اگر کالم نویسی کے آغاز کی بات کی جائے تو برصغیر میں تو 1780ء میں کالم نگاری کا آغاز ہو گیا تھا، جب جیمز آگسٹس ہکی نے اپنا ہفت روزہ "ہکی گزٹ" جاری کیا تھا۔ حالانکہ یہ انگریزی میں شائع ہونے والا اخبار تھا جو سماجی پریشانیوں کو عیاں کرتا تھا اور کمپنی پر تنقید کرتا تھا۔ اس کا انداز تحریر ایسا تھا کہ جس کو آج کی کالم نگاری کے قریب ترین سمجھا جا سکتا ہے۔ اس گزٹ میں کچھ خطوط ایسے شائع کیے جاتے، جو حکومت کو لکھے جاتے اور ان میں معاشرے کی خبروں کو شامل کر کے حکومت وقت کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اگر ہم برصغیر کی ابتدائی اردو کالم نگاری پر نظر دوڑائیں تو 19ویں صدی میں کالم کی صرف دو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ جن میں پہلی صورت خبری کالم کی ہے جس میں خبروں کو شائع کیا جاتا تھا اور دوسری صورت مضامین کی صورت میں تھی جس کا آغاز "اودھ پنچ" نے کیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کالم نگاری نے باقاعدہ طور پر اپنے آپ کو ایک صنف کے طور پر منوالیا تھا جو مختلف اخبارات کے ذریعے عوام الناس کی توجہ کا محور بنی۔ جن میں "جام جہاں نما" کے ساتھ "دہلی اردو اخبار"، "مظہر الحق"، "فوائد الناظرین"، "قران السعدین"، "نور مشرقی"، "نور مغربی"، "صادق الاخبار"، "کوہ نور"، "دریائے نور"، "لاہور گزٹ" جیسے اخبارات نے اپنا کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی کے بعد جتنے بھی اخبارات شائع ہو رہے تھے ان میں سے اکثریت کی ادارت و ملکیت غیر مسلموں کے پاس تھی اور ان اخباروں میں زیادہ تر نقل یعنی تقلید ذریعہ خبر چل رہا تھا اور پھر تقلید کے لیے بھی کوئی جامع اور مستند ذریعہ موجود نہیں تھا۔ کالم اپنی ابتدائی صورت کو سنوار رہا تھا، انگریزی صحافت بھی ابھی ارتقاء کی منازل کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس سلسلے میں محمد اسلم ڈوگر بیان کرتے ہیں:

"جنگ آزادی کے بعد 1858ء میں اردو کے صرف بارہ اخبارات نکلتے تھے۔ جن میں سے صرف ایک کی ادارت ایک مسلمان کے سپرد تھی، یوں جنگ آزادی کے بعد کی صحافت میں مسلمانوں کا حصہ انتہائی کم ہو گیا تھا۔ لیکن کالم کے اسلوب کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو ان میں اکثر اخبارات میں "اودھ پنچ" کے اجراء تک کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی بلکہ ایک ہی انداز کی خبریں نظر آتی ہیں۔ صحافت کے اس اسلوب کی ایک وجہ تو برصغیر میں صحافتی تجربات کا فقدان تھا۔ اکثر اخبار نویسوں کے پاس تقلید کے لیے کوئی قابل قدر نمونہ نہیں تھا۔ ابتداء میں علمی اخبارات کی روایت سے مطبوعہ اخبارات میں استفادہ کیا جاتا تھا۔ انگریزی صحافت برطانیہ میں ابھی ترقی کی منازل طے کر رہی تھی اور اکثر دیسی اخبارات کے مدیروں کی انگریزی زبان سے ناواقفیت ان کے برطانوی صحافتی تجربات سے استفادہ کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔"[2]

یعنی کالم ایک مضبوط، ٹھوس اور پتھروں سے بنا ہوا عمودی کھمبا ہے جو عمارت کو سہارا دینے یا محض سجاوٹ کے طور پر بنایا جاتا ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ بطور ایک یادگار کے تنہا اُٹھایا ہوا ایک ستون کالم کہلاتا ہے۔ یا پھر ستونی شکل کی کوئی بھی چیز جیسے دھوئیں کی اوپر کو اٹھتی ہوا ستون نما شکل۔ وہ عمودی خانے جن میں کسی کتاب یا اخبار کا صفحہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ یا اخبار یا رسالے کی وہ مخصوص تحریریں جو کسی مخصوص مصنف سے

لکھوائی جائیں کالم کہلاتی ہیں۔ اردو صحافت کی تاریخ میں کالم نگاری نے اپنی اہمیت کو خود اجاگر کیا ہے۔ کالم نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ ہر صحافی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھا کالم نگار ثابت ہو اور لوگ اس کی تحریروں کو پسند کریں۔ کالم نگاری کی تعریف کے حوالے سے محمد اسلم ڈوگر "فیچر، کالم اور تبصرہ" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "کالم کے لغوی معنی قطار، کھمبا، ستون، مینار اور صفحے کا حصہ ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ فوج سے آیا ہے جہاں فوج کے ایک نظم کے ساتھ کھڑے ہونے یا چلنے کو کالم کہا جاتا ہے۔ کالم کا لفظ اخبار میں شائع ہونے والی ان تحریروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی مستقل عنوان کے تحت کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔"[3]

کالم ایک ایسی صنف ہے جس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے یہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے کیونکہ اب کالم میں اتنی وسعت موجود ہے کہ وہ ہر موضوع اور ہر میدان کو اپنے اندر سمیٹ لے۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان کو جن مسائل نے گھیرے میں لیا ان میں مہاجرین کی آبادکاری سب سے اہم مسئلہ تھا جو کالم نگاری کا اہم موضوع بھی بنی۔ اس عہد کے لکھاریوں نے ہجرت کو جیسے دیگر اصناف شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور ناول میں استعمال کیا ویسے ہی کالم نگاری بھی ہجرت سے اپنا دامن نہ بچا سکی۔ اس عہد کے دیگر اہم واقعات میں قائداعظم محمد علی جناح کا گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہونا، اقوام متحدہ میں پاکستان کا رکنیت حاصل کرنا، مسئلہ کشمیر، قومی ترانے کا وجود میں آنا، اسٹیٹ بینک کا قیام، ریاست جونا گڑھ پر ہندوستانی فوج کا قبضہ، یہ ایسے موضوعات تھے جو اس دور کے ادب کا حصہ بنے۔ اس دور کا ایک اور اہم واقعہ 1958 میں نافذ ہونے والا پہلا مارشل لاء تھا جس نے ملکی صورتِ حال کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ نومولود ریاست میں عوام کے لیے نئے نئے مسائل نئی نئی پریشانیاں جب مصنفین کو نظر آئیں تو یہی موضوعات بن کر ادب کا حصہ بنیں۔ کیونکہ مصنف وہ شخص ہوتا ہے جو درد دل رکھنے والا اور گہری نگاہ رکھنے والا ہوتا ہے جس کی نظر عوامی و ملکی مسائل پر بڑی گہری ہوتی ہے جہاں کہیں اسے کوئی ناہمواری نظر آتی ہے وہ اسے اپنی تحریر کا حصہ ضرور بناتا ہے۔ ملک پاکستان آزاد ہوتے ہی بے شمار مسائل کا سامنا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی حالات سنبھلنے ہی نہ پائے تھے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کو 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا۔ ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے معاشرے کی جیسی صورتِ حال ہو گی ادب ویسا ہی تخلیق ہو گا، یوں اس دور کی کالم نگاری میں ذہنی کشمکش، ملکی سیاسی ابتری اور نفسا نفسی عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ملکی صورتِ حال بڑی نازک ہو چکی تھی، ایوب خان اقتدار کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا 1958ء میں انہیں ملک کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہی اسی دن انہوں نے اپنی کابینہ کا اعلان کیا۔ جس میں تین فوجی افسران کو جن میں جنرل اعظم خان، لیفٹیننٹ جنرل واجد علی برکی، لیفٹیننٹ جنرل کے ایم شیخ اور آٹھ سویلین شامل کیے گئے جن میں ذوالفقار علی بھٹو بھی موجود تھے۔ اس دور کے اخبارات میں روزنامہ زمیندار، روزنامہ "نوائے وقت"، "جنگ"، "احسان"، "شہباز" اور "انقلاب" نمایاں ترین اخبارات میں شمار ہوتے تھے جن کا ساتھ دینے کے لیے دیگر اخبارات میں "امروز"، "سفینہ"، "نوائے پاکستان"، "مغربی پاکستان"، "کوہستان" وغیرہ موجود تھے۔ اس دور کے نمایاں کالم نگاروں میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری، حاجی لق لق، مجید نظامی، میاں محمد شفیع، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، نصراللہ خان عزیز، ظہور الحسن ڈار، صلاح الدین ناسک، سعادت خیالی، منو بھائی اور شوکت تھانوی جیسے نام نمایاں تھے، جنہوں نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے اپنے معاشرے کی اور اپنے سماج کی گوناگوں تبدیلیوں کو بیان کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ میاں محمد شفیع کا کالم "لاہور کی ڈائری" چراغ حسن حسرت کے قلم سے ادا ہونے والا "حرف و حکایت" جو بعد میں احمد ندیم قاسمی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ نصراللہ خان عزیز کا "تکلف بر طرف" کے عنوان سے لکھا جانے والا کالم بہت نمایاں تھا جو روزنامہ "ایشیا" میں "سیر و سفر" کے عنوان سے بھی کالم لکھتے تھے۔ چراغ حسن حسرت "کوچہ گرد" کے عنوان سے کالم لکھتے تھے اس کے علاوہ انہوں نے "سندھ باد

جہازی "کا قلمی نام مشہور اخبار "نئی دنیا" میں کالم لکھتے وقت اختیار کیا تھا۔ حسرت بعد میں "زمیندار" کے ساتھ منسلک ہو گئے، بعد میں روزنامہ احسان میں "مطالبات" کے عنوان سے کالم لکھے۔ چراغ حسن حسرت کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک کا نام بھی اس عہد کی صحافت اور کالم نگاری میں سنہرے حروف میں لکھا جاتا ہے جن کو اردو صحافت میں فکاہی کالم نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ پہلے پہل "زمیندار" کے عملہ ادارت میں شامل رہے اور "افکار و حوادث" کے عنوان سے معروف کالم تحریر کرتے رہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے عہد کے معاشرتی مسائل کو بیان کرنے کا حق ادا کر دیا انہوں نے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا، سیاسی شعبدہ بازیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا، معاشرتی بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر پر کھل کر تنقید کی۔ افکار و حوادث میں عبدالمجید سالک نے ملکی سیاسی صورتِ حال اور معاشرتی بگاڑ کو واضح طور پر بیان کیا، کہیں بھی انہوں نے کوئی رکھ رکھاؤ یا طرفداری کا معاملہ نہیں اپنایا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس عہد میں سیاسی مخالفین ایک دوسرے کو گرانے اور پچھاڑنے پر تلے ہوئے تھے جس کا فائدہ ملک دشمن عناصر اٹھا رہے تھے۔ ایسے معاملات اور ایسی صورتِ حال کو خبر کا حصہ بنانا اور اسے عوام الناس کے سامنے لانا یہ کسی بہادری سے کم نہیں مگر عبدالمجید سالک جیسے نڈر صحافی کبھی بھی ایسی بات کو بیان کرنے سے پیچھے نہ ہٹے۔

عبدالمجید سالک کے طرز ادا، ان کے فن کی شائستگی و لطافت اور ان کی قلم کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر عالم ظفری رقم طراز ہیں:

> "اردو فکاہی کالم کی تاریخ میں مولانا عبدالمجید سالک نے جو لطیف شگفتہ، ہلکے اور گہرے طنزیہ اور مزاحیہ کالم لکھے ہیں، وقت کی دھول اور زمانے کی گرم و سرد ہوا ان کی تر و تازگی کو کم نہیں کر سکتی۔ فکاہات کے شاہ سوار جب تک دبستان سالک سے خوشہ چینی نہ کر لیں دو قدم آگے بڑھانا مشکل سمجھتے ہیں۔ سالک کے کالم ادب و صحافت کا خوبصورت امتزاج ہیں۔"[4]

اس عہد کے ایک اور اہم کالم نگار جن کا اصل نام عطاء محمد تھا مگر حاجی لق لق کے نام سے ادبی حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ روزنامہ "انقلاب"، "شہباز"، "نوائے پاکستان"، "احسان" اور "زمیندار" سمیت تقریباً پاکستان کے تمام قابل ذکر اخباروں میں ان کی تحریریں زینت بنتی رہیں۔ وہ ایسا فن جانتے تھے جو ان کے ہم عصر کالم نگار کم کم استعمال کرتے تھے، وہ پھبتی کسنا اور گہرا طنز کرنا اپنی تحریروں میں شامل کرتے جس سے وہ مزاح مزاح میں معاشرتی ناہمواریوں پر چوٹ بھی کرتے اور ان کا حل تلاش کرنے کے مشورے بھی فراہم کرتے۔ پھر ان کے قلم میں جو روانی تھی اور دل موہ لینے والا انداز تھا وہ قاری کو اپنی گرفت میں قابو کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان کی تحریروں کو لوگ صبح کے ناشتے کا مزہ دوبالا کرنے کے لیے اپنی ناشتے کی میز پر سجایا کرتے تھے یعنی اپنے عہد کے قارئین کے پسندیدہ لکھاری تھے۔ کیونکہ یہ وہ لکھاری تھے جنہوں نے تحریر کو عام قاری کے فہم تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مجید لاہوری جو مجید چوہان کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں اردو کالم نگاری میں ایک بڑا اضافہ اور بڑا نام تھا جو "حرف و حکایت" کو بڑی دیر تک قارئین تک پہنچانے کی اہم ترین ذمہ داری نبھاتے رہے۔ آہنگ و زبان عوام کی پسندیدہ، ہر خاص و عام کے دل تک رسائی رکھنے والے لکھاری جنہوں نے اپنے مزاحیہ کرداروں مولوی گل شیر، سیٹھ ٹیوب جی، ٹائر جی، بینک بیلنس جی اور رمضانی جیسے بے مثال کردار کے ذریعے معاشرتی مسائل کو مزاح کے لبادے میں لپیٹ کر عوام الناس تک پہنچانے کی ذمہ داری نبھائی۔ ملکی حالات کی کشمکش کی وجہ سے عام انسان سنجیدہ سے سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا جو اپنے مسائل کے ساتھ ساتھ ملکی مسائل میں بھی الجھا ہوا تھا۔ ایسے میں مجید لاہوری جیسے طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہوں نے عوام کے چہروں سے دکھوں کو اتار کر ہنسی و خوشی کا لیپ لگا دیا۔ کیونکہ مجید لاہوری فقط کالم نگار ہی نہیں تھے بلکہ ان کی مزاحیہ نظمیں اور غزلیں بھی لوگ چٹخارے لے لے کر پڑھتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار درویش صفت کالم نگاروں اور اردو کے معتبر لکھاریوں میں ہوتا ہے کیونکہ ان کا تعلق ایک درویش گھرانے سے تھا جو علم و فن سے بھی خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔

یہی دور تھا جب پاکستان کی تاریخ کو 10 سالہ مارشل لاء سے گزرنا پڑا۔ جس میں بہت سے اہم سیاسی و معاشرتی واقعات ہوئے اس میں دارالحکومت بھی تبدیل ہوا، 1956ء کے آئین کو تبدیل کر کے اس میں بہت سی نئی شقیں شامل کی گئیں، پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس دور پر اگر غور کیا جائے تو ملک پاکستان کے حالات دگرگوں نظر آتے ہیں، فضا کچھ ملکی عوامی مفاد کے لیے بہتر نہ تھی، معاملات الجھے ہوئے تھے، ادارے استحکام چاہتے تھے، اوپر سے مہاجرین کا مسئلہ جو تا حال حل نہ ہو سکا تھا۔ بہت سے مسائل تھے جو اس وقت ملک کی صورتِ حال کو درپیش تھے۔ ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اس لیے ادب کا رخ بھی اسی جانب پلٹتا ہے، جدھر ادیب کا ماحول اور ادیب کا معاشرہ چل رہا ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ جب معاشرہ سماجی پستی، ناانصافی، لوٹ کھسوٹ اور ناہمواریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسی دور میں ایسا ادب تخلیق ہوتا ہے جو عوام الناس کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ جاتا ہے۔ اندر ہی اندر سے ملک دولخت ہو رہا تھا، سیاسی عدم استحکام معاشرے کا حصہ بن چکا تھا، سیاسی منافرت سماج میں پھیل چکی تھی، لوگوں کا سیاست دانوں سے اور سیاسی عمل سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔ حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ مغربی پاکستان میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور مشرقی پاکستان میں اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر تک کو قتل کر دیا گیا۔ معاشرے کے ادیبوں کی نظر معاشرے کے حالات پر تھی جب سکندر مرزا نے 1958ء میں مرکزی صوبائی حکومتوں کا خاتمہ کر کے مارشل لاء نافذ کیا اور بری فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان کو اس کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ جنرل ایوب خان نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا اور اپنی نئی کابینہ کا اعلان کیا اور تین ہی دن میں سکندر مرزا سے استعفیٰ لے کر ان کو ملک بدر کرنے کا اعلان کیا اور خود عہدہ صدارت پر جا بیٹھے۔ 1958ء کے مارشل لاء کے بعد سرکاری ریڈیو اور اخبارات کو یہ ڈیوٹی سونپ دی گئی کہ وہ ہر وقت فوج کی مداح سرائی اور تعریفوں کے ترانے گاتے ہوئے نظر آئیں۔ عوام تک ان حالات کو پہنچانے کی ذمہ داری سب سے پہلی اس عہد کے ادیب کی تھی اور دوسرا سہارا جو عوام کو میسر تھا وہ قانون کی حکمرانی کا تھا، جو جسٹس ایم آر کیانی کی زبانی شہریوں کی آواز کو بلند کر رہا تھا۔ جسٹس ایم آر کیانی جو مارشل لاء کے نفاذ کے سخت خلاف تھے ان کا کہنا تھا کہ مارشل لاء کسی قوم کی سب سے بدنصیبی کی حالت ہوتی ہے جو تنہا نہیں بلکہ فوجی دستوں کے ساتھ ملک پر لاگو ہوتی ہے۔ جنرل ایوب خان نے ملکی صورتِ حال کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ جس میں "پاکستان رائٹر گلڈ" کا قیام بھی ہوا، مہاجرین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کورنگی کے مقام پر ہاؤسنگ سکیم بھی شروع ہوئی اور بھی بہت سے ایسے کام تھے جو اس وقت معاشرے کو بحال کرنے کے لیے کیے گئے۔ 1965ء میں ملکی تاریخ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ ملک کے صدارتی انتخابات تھے جس میں دو مضبوط امیدواروں نے حصہ لیا، ایک فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور دوسرا امیدوار مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔ محمد ایوب خان نے اس معرکے کو آسانی سے سر کیا کیونکہ وہ محترمہ فاطمہ جناح سے اچھا مقرر تھا، لوگوں کے جذبات سے کھیل گیا۔ یہاں پہلی مرتبہ جب محمد ایوب خان کو صدارت کا عہدہ مل گیا تو چین نے پاکستانی حکومت کو چین کے دورے کی دعوت دی، جسے قبول کیا گیا اور یہیں سے پاک چین دوستی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی دورانیے میں 1965ء کی جنگ جس میں بھارت نے پاکستانی سرحدوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے رات کو لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ جس کا مقابلہ پاکستانی افواج نے ڈٹ کر کیا اور یہ جنگ 17 دن جاری رہنے کے بعد بالآخر معاہدہ تاشقند پر ختم ہوئی۔ جس پر صدر ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے دستخط موجود ہیں۔ 1966ء میں جب شیخ مجیب الرحمٰن نے جو نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ تھے اپنے چھ مطالبات پیش کیے۔ ان مطالبات میں وہ دفاع اور امور خارجہ وفاق کے پاس رکھنے کے حامی تھے، باقی تمام محکمے صوبائی حکومتوں کو دینے کے خواہش مند تھے۔ پاکستان کے دونوں صوبے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی کرنسی کو علیحدہ علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ٹیکسوں کے نفاذ میں بھی صوبائی حکومتوں کی اجارہ داری کے خواہش مند

تھے۔ یہاں ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات بھی اہم ترین موڑ تھے۔ بھٹو چاہتے تھے کہ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کو معاہدہ تاشقند پر دستخط نہیں کرنا چاہیے تھے۔ ایوب حکومت نے بھٹو کو خرابی صحت کا بہانہ بنا کر خود سے علیحدہ کیا تو عوام میں ہلچل میں مچ گئی، بھٹو کا لاہور راولپنڈی میں والہانہ استقبال ہوا کراچی میں ہر جگہ بھٹو کے نعرے لگنے لگے اور یہیں سے ذوالفقار علی بھٹو نے سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس دور میں صحافت پر بے شمار پابندیاں لگا دی گئیں، سیاسی موضوعات پر لکھنا ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا اور اپریل 1959ء میں جب پاکستان "ٹائمز"، "امروز"، "لیل ونہار" شائع کرنے والے ادارے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو حکومتی تحویل میں لے لیا گیا، ان کو کسی قسم کی خبر شائع کرنے پر پابندی لگا دی گئی اور میاں افتخار الدین کو عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ محمد سرفراز کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ اگلے ہی روز 19 اپریل کو ملکی اخباروں کے پہلے صفحے پر جو خبر شائع ہوئی وہ کچھ یوں تھی:

"پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے چاروں اخبارات "پاکستان ٹائمز"، "امروز" (کراچی)، "امروز"، (لاہور) اور ہفتہ وار "لیل ونہار" کو سنیچر (18 اپریل) کے روز مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ حکومت پاکستان نے یہ قدم پاکستان سیکیورٹی ایکٹ کی دفعہ 2 کے تحت اٹھایا۔ جس میں جمعرات 16 اپریل کو جاری ہونے والے ایک صدارتی آرڈیننس کی دفعہ 2 کے دائرہ اختیار میں اضافہ کر کے حکومت کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ایسے اخبارات کی اشاعت پر مکمل پابندی لگانے کی بجائے ان کی انتظامیہ کو تبدیل کر سکتی ہے جو حکومت کی رائے میں ایسا مواد شائع یا شامل کریں جس سے دفاع ،امور خارجہ پاکستان یا پاکستان کی سلامتی کو خطرہ ہو۔"[5]

حکومت کی طرف سے اعلان تھا کہ کچھ اخبارات ایسا مواد شائع کر رہے ہیں جو عوام کے ذہنوں میں بغاوت کی چنگاری کو ہوا دیتے ہیں۔ اس دوران پاکستان ٹائمز نے نیا ورق کے عنوان سے ایک اداریہ بھی شائع کیا جو قدرت اللہ شہاب کا لکھا تھا اس اداریئے میں اعلان یہ تھا کہ تمام اخبارات گھر میں اجنبی ہو گئے۔

اس دور کے اہم ترین کالم نگار شوکت تھانوی تھے جو روزنامہ "جنگ" میں "وغیرہ وغیرہ" اور "پہاڑ تلے" کے عنوان سے کالم تحریر فرماتے تھے۔ شوکت تھانوی اوائل عمری سے ہی لکھنے میں مصروف تھے۔ نوجوانی میں پہنچ کر وہ ایک منجھے ہوئے لکھاری بن گئے جو عوامی جذبات، عوامی احساسات اور عوامی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا بخوبی جانتے تھے۔ شوکت تھانوی جریدہ "تحریک" سے بھی وابستہ ہوئے جو جلد ہی ہفت روزہ "ہمدم" میں منتقل ہو گیا۔ وہاں "دو دو باتیں" کے عنوان سے مستقل کالم تحریر فرماتے تھے۔ مزاح نگاری کے لبادے میں انہوں نے عوامی احساسات کی ترجمانی کرنے کا حق ادا کر دیا۔ نے رنگ خیال کا جب سال نامہ جاری ہوا تو اس میں "سودیشی ریل" شائع ہوا جس نے شوکت تھانوی کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اور شوکت تھانوی ہر خاص و عام کی ذہنی رسائی تک موجود تھا۔ شوکت تھانوی کے بارے میں شفیق جالندھری بیان کرتے ہیں:

"انہوں نے نئی نسل کی نازک مزاجی اور بے راہ روی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ شوکت کا مزاح کسی غیر معمولی واقعہ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ زندگی کے مضحک پہلو تلاش نہیں کرتے بلکہ ہر سنجیدہ سے سنجیدہ معاملے کے مضحک پہلو بھی ان کے ذہن میں موجود رہتے ہیں۔ ہر مسئلے پر ان کا قلم خوب چلتا ہے لیکن زود نویسی کے باوجود تحریر میں کہیں بھی شگفتگی و برجستگی کی کمی نہیں ملتی۔ اپنے کالم میں وہ قارئین کو ایک حقیقی مزاح نگار کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ جو اپنی حد سے تجاوز کرنے والوں کے پیار سے کان بھی مروڑتا ہے، ظاہر بازوں پر طعن بھی توڑتا ہے اور گھپلا کرنے والوں کو بے نقاب کر کے چھوڑتا ہے۔ وہ

اپنے عام سے روز مرہ واقعات و معاملات کا قصہ بھی چھیڑتا ہے تو سننے والے محظوظ ہونے اور لطف اٹھانے کے لیے سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک ایک فقرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مسکراتے ہیں اور گاہے قہقہہ بھی لگاتے ہیں۔"[6]

شوکت تھانوی کا اسلوب نہایت سادہ اور دل نشین تھا، سیدھی سیدھی لائنوں میں حرف حرف میں معنی چھپے ہوتے تھے، وہ اپنے گرد و نواح کے ماحول پر کڑی نظر رکھتے تھے اور جہاں کہیں انہیں معاشرے میں ناہمواری نظر آتی وہ اس پہ طنز ضرور کرتے تھے۔ ان کے پسندیدہ اور اہم ترین موضوعات میں وہ معاشرتی بگاڑ تھا۔ جس نے عوام کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا، عام آدمی سے ہمدردی کا جذبہ شوکت تھانوی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ معاشرے کے بہترین عکاس اور بہترین کالم نگار تھے۔

اس عہد کے ایک عظیم ترجمان، مزاح نگار، کالم نگار، سفر نامہ نگار اور مشہور شاعر ابن انشاء جو اس عہد کی ترجمانی کے لیے جانے جاتے ہیں۔ معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی تبدیلیوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا اور عوام الناس کے لیے ان خفیہ گوشوں تک رسائی حاصل کی جہاں عام ادیب کا جانا ممکن نہ تھا اور پھر اسے عوام تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ابن انشاء "امروز" روزنامہ "انجام" ہفت روزہ اخبار "اخبار خواتین" اور روزنامہ "جنگ" میں کالم نگاری کرتے رہے اور "باتیں انشاء جی کی" اور "دخل در معقولات" کے عنوان سے بے شمار کالم عوام الناس تک ان کے پہنچ چکے ہیں۔ جن میں معاشرتی اور سیاسی واقعات کو پس منظر کے ساتھ بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ابن انشاء اپنے عہد کے جانے مانے کالم نگار تھے جنہوں نے اپنے معاشرے کی عکاسی کا حق ادا کر دیا اور جو فریضہ ایک ادیب کے ذمے آتا ہے اس کو پوری ایمانداری اور انصاف کے ساتھ پورا کیا۔ حالانکہ ان کے عہد میں ادیب کے قلم کو کھل کر بیان کرنے کی اجازت نہ تھی، کالم نگاروں صحافیوں پر پابندیاں بلکہ سخت ترین پابندیاں موجود تھیں۔ مگر ابن انشاء ایک نڈر صحافی تھے، جنہوں نے بنا کسی خوف و خطر کے حق بات کو بیان کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ان کے کالم "باتیں انشاء جی" کی اور "آپ سے کیا پردہ" کے عنوان سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اپنے سادہ اسلوب میں ایسی بات کر جاتے کہ پڑھنے والا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ شفیق جالندھری اردو کالم نویسی میں ابن انشاء کی کالم نگاری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"دور جدید کی مطابقت اور مناسبت کے ساتھ ساتھ ہمیں ابن انشاء کے کالم میں اردو کے کلاسیکی ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ وہ جا بجا محاورات، ضرب الامثال اور اشعار استعمال کرتے ہیں اور یہ استعمال ہمیشہ انتہائی موضوع اور بر محل ہوتا ہے۔ فقرے چھوٹے چھوٹے اور تحریر میں کمال روانی ہے۔ قدماء کی طرح صاحبو، دوستو اور تقریب میں اس کا ذکر یہ ہے جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں وہ ایک شاعر ہیں اور ان کی نثر میں شاعرانہ تخیل کی کار فرمائی ہے۔ تحریر کو پر لطف بنانے اور مزاح پیدا کرنے کے لیے واقعہ یا کردار کا سہارا نہیں لیتے، اصل لطف اور چاشنی ان کے انداز بیان میں ہے۔"[7]

سید احسان علی شاہ جو احسان بی اے کے نام سے مشہور ہوئے اس دور کے ایک اہم کالم نگار ہیں۔ جو "میری ڈائری" روزنامہ "کوہستان" میں شائع کرتے تھے۔ اس کالم میں وہ شہر کی دلچسپ تقریبات، شہر کے احوال و آثار اور اندرون شہر ہونے والے اہم واقعات کو قلم بند کرتے تھے۔ لاہور شہر چونکہ شروع سے ہی پاکستان کا دل تصور کیا جاتا ہے لہٰذا اس شہر میں ہونے والے واقعات کوئی عام واقعات نہیں ہوتے تھے۔ ان کو بیان کرنا کسی عام لکھاری کے بس کی بات نہ تھی، اس ذمہ داری کو احسان بی اے نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ لاہور کی انتظامیہ اور لاہور کی کابینہ جو اپنی اپنی ذمہ داری نبھا رہی ہے اس پر خوبصورت طنز ان کے کالم کے اقتباس میں دیکھیے:

"لاہور میونسپل کارپوریشن نے ایک متفقہ طور پر منظور ہونے والی قرارداد کے ذریعے مال روڈ کا نام بدلا ہے۔ اب یہ حسین اور جاذب نظر مال روڈ "شاہرائے قائداعظم" کے نام سے کاغذوں پر درج ہو گی۔ اس سے پہلے بھی کارپوریشن مذکورہ اس

میری خوشی کے یہ نعرے فضائے بسیط میں گم ہو گئے اور میری آنکھیں یہی دیکھتی رہیں کہ قرارداد فائل کی طاق نسیاں کی زینت بنادی گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ قرارداد کے منظور ہو جانے کے بعد بھی سڑکوں کے ناموں کے بورڈ نہیں بدلے۔ ٹیمپل روڈ اس عجوبہ کاری کی ایک مثال ہے اگر کوشش کی جائے تو اور بھی مثالیں مل جائیں گی، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ لاہور کارپوریشن کے ارکان اور اس ادارہ عالیہ کی انتظامیہ میں کسی قسم کا کوئی رابطہ یا رشتہ موجود نہیں ہے۔ ارکان قرارداد پاس کر کے اپنا فرض پورا کرتے ہیں، انتظامیہ اسے نظر انداز کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔"[8]

ابراہیم جلیس کا شمار بھی ستر کی دہائی کے معروف کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جو روزنامہ "امروز" اور روزنامہ "جنگ" میں "تکلف برطرف" کے عنوان سے مستقل کالم تحریر فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ "آپ بیتی"، "عوام بیتی" اور "وغیرہ وغیرہ" کے نام سے بھی کالم تحریر کرتے تھے۔ ابراہیم جلیس کے موضوعات زیادہ تر ایسے واقعات پر مشتمل ہوتے تھے جو ملکی سلامتی اور ملک میں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے ساتھ جڑے ہوتے تھے۔ جیسے حیدرآباد دکن پر ہندوستان کا قبضہ، جب ایک ادیب ایسی ناانصافی کو دیکھتا ہے تو پھر وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ ابراہیم جلیس نے بھی "ترنگے کی چھاؤں" کالم لکھ کر ہندوستان کے اصلی چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ ان دنوں ابراہیم جلیس ہندوستان میں ہی مقیم تھے اس کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور یہاں روزنامہ "انجام" روزنامہ "حریت" روزنامہ "جنگ" اور روزنامہ "مساوات" کے ساتھ منسلک رہے۔ ابراہیم جلیس ایک جوشیلی طبیعت کے انسان تھے جو اپنے ملک کو مثالی بنتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے ملک میں کسی قسم کی معاشرتی، سماجی یا سیاسی زیادتی نہ ہو، کوئی عدم مساوات نہ ہو۔ اگر وہ کوئی ایسا معاملہ دیکھتے ہیں تو پھر اپنے کالموں میں اس واقعے کو گہری طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ سیاست دانوں اور منافق سماجی خیر خواہوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور عوام الناس تک ان کا اصلی چہرہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1952ء میں جب حکومت پاکستان نے "پبلک سیفٹی ایکٹ" نافذ کیا تو ابراہیم جلیس نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے "پبلک سیفٹی ریزر" کے عنوان سے کالم تحریر کیا، جس کی پاداش میں ان کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی، یہیں بیٹھ کر انہوں نے "جیل کے دن جیل کی راتیں" بے مثال کتاب لکھی۔

ابراہیم جلیس معاشرتی ناسور جن میں تھانیداری، نمبرداری، ٹھیکیداری، سرمایہ داری، جاگیرداری جیسے مہلک امراض جو معاشرے کا حصہ بن چکے تھے وہ اپنے کالموں کے ذریعے اس مرض کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ معاشرہ ایسا بن جائے جس میں انسانی استحصال کے تصورات ختم کر دیئے جائیں، ذات و رنگ و نسل کے تفرقات مٹا دیے جائیں۔ کیونکہ ان کو اپنے وطن، اپنے وطن کی مٹی، مٹی کے باسیوں، اس چمن میں رہنے والے مزدوروں، جوانوں، کسانوں اور محنت کشوں سے شدید محبت تھی۔ جب ان پر کوئی ناانصافی والا معاملہ ہوتا تو ابراہیم جلیس تڑپ جاتے اور ان کے دکھ میں دکھی نظر آتے۔ ابراہیم جلیس کے کالموں پر بات کرتے ہوئے ظفر عالم ظفری اردو صحافت میں طنز و مزاح میں بیان کرتے ہیں:

ابراہیم جلیس کے کالموں میں جو چیز شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ سیاسی و سماجی بے راہ رویوں پر طنز کرتے ہیں، ایوانوں سے بلند ہوتے ہوئے قہقہوں کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔ سیاسی پہلوانوں کے مضحک افعال و اعمال پر ہنستے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانوں کی شب تیرہ و تار کی انتہا بھی مستقبل میں دیکھتے ہیں۔ اعلیٰ اور تابندہ مستقبل سے انسانیت کی اُمیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ساری عمر قلمی جہاد میں گزاری۔ ان کا جہاد غربت، افلاس، ناداری، بیماری، سماجی، ناہمواری اور سیاسی اجارہ داری کے خلاف تھا، اس جہاد کے سلسلے میں انہوں نے 1952ء میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔[9]

احمد ندیم قاسمی کالم نگاری کے اُفق پر دمکتا چمکتا ہوا مہتاب صحافت جنہوں نے "امروز" میں "حرف و حکایت" کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا اور پھر تمام زندگی اردو صحافت اور کالم نگاری کے نام کر دی۔ روزنامہ "جنگ" میں "رواں دواں" کے عنوان سے مستقل کالم تحریر فرماتے رہے۔ ابتداء میں ہی احمد ندیم قاسمی نے اردو صحافت پر اپنا رعب و دبدبہ جمالیا اور پھر پاکستان کے تمام معروف اخباروں جن میں "ہلال پاکستان"، "احسان"، "حریت"، "جنگ" کے ساتھ منسلک رہے اور مختلف عنوانات کے تحت جن میں موج در موج، لاہور لاہور ہے، لاہوریات، اور رواں دواں کے عنوانات کے ساتھ اور مختلف قلمی ناموں جن میں عنقا، پنج دریا وغیرہ معروف ہیں کالم لکھتے رہے۔ احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری معاشرتی اصلاح کے لیے تھی، ان کے ہاں طنز اور طعنے موجود تھے مگر اتنے نہیں کہ ان کی تحریروں پر غالب آجائیں، مزاح کا پہلو ان کے ہاں نمایاں نظر آتا ہے اور وہ کسی ایسے امر پر مزاح کرتے تھے جس کی اصلاح چاہتے تھے، ان کا مزاح فقط ہنسی اور دل بہلانے کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ معاشرتی اصلاح اوّلین ترجیحات میں شامل رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری بیان کرتے ہیں:

> "قاسمی انسانی معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسان سمجھا جائے، آدمی کو آدمیت کے درجے سے نہ گرایا جائے۔ ان لوگوں پر ان کا وار بڑا گہرا اور سخت ہوتا ہے جو تحقیر انسانیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں میں غریب سے ہمدردی کا جذبہ، انسانیت سے دوستی، ٹھگوں، لٹیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور تقدیر انسانی سے کھیلنے والوں کے خلاف ایک بلند آہنگ آواز پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستان سے باہر بھی تانک جھانک کا عمل جاری رکھتے ہیں اور جہاں بھی تحقیر انسانیت دیکھتے ہیں نوک قلم کو سیدھا کر لیتے ہیں۔"[10]

احمد ندیم قاسمی کا انداز بیان دوسرے کالم نویسوں سے الگ تھلگ ہے، وہ اپنے کالم کا آغاز کسی واقعہ سے کرتے ہیں اور پھر اپنے ضرب المثل کے خوبصورت استعمال سے اس واقعہ کو جاندار بنا دیتے ہیں۔

1970ء کے انتخابات پاکستانی تاریخ کا ایک نیا موڑ تھا، جب جنرل محمد یحییٰ خان نے خطاب کرتے ہوئے اقتدار کی منتقلی کا اعلان کیا اور ملک میں نئے انتخابات کروانے کا عندیہ دیا۔ یہ انتخابات پہلے انتخابات تھے جس میں عوامی رائے کو ترجیح دی گئی، اس میں مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ اور مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اکثریت حاصل کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دونوں صوبوں کی سیاست میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ ملک کی قسمت تین افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن میں جنرل محمد یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو شامل تھے۔ یہاں اقتدار کی منتقلی میں سستی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات نے ملک کو ایک نئے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ 1971ء کے اوائل میں عوامی لیگ نے، جسے پشت پناہی بھارت کی حاصل تھی سول نافرمانی کا اعلان کر دیا، مارچ کے تیسرے ہفتے میں جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو جو عوامی لیگ کے رہنما اور سربراہ شیخ مجیب الرحمن سے مذاکرات کرنے کے لیے ڈھاکہ پہنچتے ہیں۔ مگر یہ مذاکرات کسی مستقل نقطے پر نہ پہنچ سکے، یحییٰ خان نے فوجی ایکشن کا منصوبہ بنایا، اس کو سرچ آپریشن کا نام دیا گیا۔ جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا، عوامی لیگ کے تمام کارکن بھارت فرار ہو گئے۔ عوامی لیگ کی عسکری تنظیم مکتی باہنی کے سربراہ کرنل عثمانی تھے، وہ بھارتی طاقت اور تربیت کے زور پر پاکستانی فوج کا مقابلہ کرنے لگے۔ ڈھاکہ میں ایک رات تو پر سکون گزر گئی مگر مشرقی پاکستان اب علیحدہ حکومت بنانے کے درپے تھا۔ وہ اب مغربی پاکستان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں سقوط ڈھاکہ کا دل خراش واقعہ جو پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر گیا وقوع پذیر ہوا۔

حوالہ جات:

1 احمد قدوس جاوید، ڈاکٹر، **ادب اور سماجیات**، (الہٰ آباد: ایگل آفسٹ پرنٹر، 1984ء)، ص4-5۔
2 محمد اسلم ڈوگر، **فیچر کالم اور تبصرہ**، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1988ء)، ص80۔
3 ایضاً، ص11۔
4 ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر، **اردو صحافت میں طنز و مزاح**، (کراچی: فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، 1996ء)۔
5 **روزنامہ جنگ**، (راولپنڈی: 19 اپریل 1959ء)، ص1۔
6 شفیق جالندھری، **اردو کالم نویسی**، (لاہور: اے ون پبلشرز، 1993ء)، ص123۔
7 ایضاً، ص134۔
8 احسان بی اے، "**میری ڈائری**" (کالم)، مشمولہ روزنامہ کوہستان، 12 اکتوبر 1967ء۔
9 ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر، **اردو صحافت میں طنز و مزاح**، ص264۔
10 ایضاً، ص255۔